ریحان احمد یوسفی

ہمارا اخلاقی بحران

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اخلاقی بگاڑ آج ہماری زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو چکا ہے۔ امانت، دیانت، صدق، عدل، ایفاے عہد، فرض شناسی اور ان جیسی دیگر اعلیٰ اقدار کمزور پڑتی جا رہی ہیں۔ کرپشن اور بدعنوانی ناسور کی طرح معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ ظلم و ناانصافی کا دور دورہ ہے۔ لوگ قومی درد اور اجتماعی خیر و شر کی فکر سے خالی اور اپنی ذات اور مفادات کے اسیر ہو چکے ہیں۔ یہ اور ان جیسے دیگر منفی رویے ہمارے قومی مزاج میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ وہ صورت حال ہے جس پر ہر شخص کف افسوس ملتا ہوا نظر آتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایسے میں ضروری ہے کہ اس مسئلے کا تفصیلی جائزہ لے کر ان عناصر کی نشان دہی کی جائے جو ہمارے اجتماعی بگاڑ کا سبب بن رہے ہیں۔ البتہ، اس سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی اعتبار سے اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت کو واضح کیا جائے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اگر ہم نے اصلاح کی کوشش نہ کی تو اس کے کتنے سنگین نتائج نکل سکتے ہیں۔

اخلاقی اقدار کی اہمیت

انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے، لیکن ہمیں ایک لمحے کے لیے رک کر یہ سوچنا چاہیے کہ انسان کو جانوروں سے ممتاز کرنے والی چیز کیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ جانور صرف اور صرف اپنی جبلت کے تابع ہوتے ہیں۔ مثلاً جب کسی جانور کو بھوک لگتی ہے تو اس کے لیے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے برعکس ایک انسان زندگی کے ہر معاملے میں کچھ مسلمہ اخلاقی حدود کا لحاظ رکھتا ہے۔ وہ جب اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کی اخلاقی حس اسے خبردار کرتی ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے لیے کوئی غلط راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ تاہم جب انسان کی اخلاقی حس کمزور ہو جاتی ہے تو وہ صحیح اور غلط کی تمیز کھونے لگتا ہے۔ وہ ایک جانور کی طرح ہر کسی کے کھیت کھلیان میں گھس جاتا ہے۔ وہ اپنی ضرورت کے لیے ہر جائز و ناجائز راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا رویہ اختیار کرنے والوں کے سفلی جذبے آہستہ آہستہ ان پر غلبہ پا لیتے ہیں۔ جس

کے بعد انسانوں کے معاشرے میں جنگل کا قانون رائج ہو جاتا ہے اور آخر کار پوری قوم تباہی کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس تباہی کی وجہ یہ ہے کہ انسان اصلاً ایک معاشرتی وجود ہے۔ معاشرتی زندگی کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ انسان کا حیوانی وجود دینا نہیں جانتا، صرف لینا جانتا ہے۔ چاہے اس کا لینا دوسروں کی موت کی قیمت پر ہو۔ یہ اصلاً انسان کی اخلاقی حس ہے جو حقوق کے ساتھ فرائض سے بھی انسان کو آگاہ کرتی ہے۔ اجتماعی زندگی کا اصل حسن احسان، ایثار اور قربانی سے جنم لیتا ہے۔ جب تک اخلاقی حس لوگوں میں باقی رہتی ہے، اپنے فرائض کو ذمہ داری اور خوش دلی سے ادا کرنے والے اور ایثار و قربانی کرنے والے لوگ اکثریت میں رہتے ہیں۔ جب اخلاقی حس مردہ ہونے لگے تو ایسے معاشرے میں ظلم و فساد عام ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں پہلے معاشرہ کمزور اور پھر تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ تباہی کبھی غیر ملکی حملہ آوروں کی مرہون منت ہوتی ہے کبھی باہمی آویزشوں کے نتیجے میں جنم لیتی ہے۔

یہ صرف ہمارا خیال نہیں، بلکہ قوموں کی تاریخ پر نظر رکھنے والا عظیم مسلمان عالم ابن خلدون بھی ہمارے اس نقطۂ نظر کی تصویب کرتا ہے۔ وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''مقدمہ'' میں بتاتا ہے کہ دنیا میں عروج و ترقی حاصل کرنے والی قوم ہمیشہ اچھے اخلاق کی مالک ہوتی ہے، جبکہ برے اخلاق کی حامل قوم زوال پزیر ہو جاتی ہے۔

ابن خلدون نے جو بات کہی ہے، آج کے حقائق بھی اسے بالکل درست ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ عصر حاضر میں جو اقوام عروج و ترقی میں سب سے آگے ہیں، وہ مسلمہ اخلاقی اقدار کی پابندی میں بھی مثالی رویے کا مظاہرہ کرتی ہیں، جبکہ اہل پاکستان جیسی اقوام جو ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے ہیں، وہ اخلاقی اقدار کی پابندی کے معاملے میں بھی بدترین انحطاط کا شکار ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اخلاقی بگاڑ کے اسباب

ہمارے نزدیک اخلاقی بگاڑ انسان کا معیاری اور اصلی رویہ نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو دین فطرت پر پیدا کرتا ہے۔ خیر و شر کا تصور انسانی فطرت میں اس طرح راسخ ہے کہ انسان اگر نارمل حالت میں ہے تو کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ یہ رویہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کا وجود کچھ بیماریوں کا شکار ہو جائے۔ ذیل میں ہم ایک ایک کر کے ان بیماریوں کا جائزہ لیں گے۔

ا۔ دنیا پرستی

اخلاقی بگاڑ کا سب سے بنیادی سبب دنیا پرستی کی وہ لہر ہے جس میں لوگ وقتی مفاد کے آگے ہر چیز کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ دنیا جتنی حسین آج ہے اتنی کبھی نہیں تھی۔ خصوصاً جن سہولتوں تک ایک عام آدمی کی پہنچ آج ممکن ہے، وہ پہلے کبھی ممکن نہ تھی۔ تاہم یہ دنیا بلا قیمت دستیاب نہیں۔ اس کے حصول کے لیے مال چاہیے۔ چنانچہ مال کمانا اور اس سے دنیا حاصل کرنا اب ہر شخص کا

نصب العین بن چکا ہے، مگر یہ مال آسانی سے نہیں ملتا۔ خاص طور پر اس شخص کو جو حلال و حرام، جائز و ناجائز، عدل و ظلم اور خیر و شر کو اپنا مسئلہ بنالیتا ہے۔ چنانچہ ایک انسان جس کا سب سے بڑا مسئلہ مال و دنیا بن جائے، اپنے مفادات کی خاطر اخلاقی اقدار سے چشم پوشی شروع کر دیتا ہے۔ جب کبھی کوئی اخلاقی قدر حصول زر کے عمل میں رکاوٹ بنتی ہے تو وہ پر کاہ کے برابر بھی اسے اہمیت نہیں دیتا۔ رفتہ رفتہ اس کا اخلاقی وجود کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور ایک روز دم گھٹ کر مر جاتا ہے۔

انسانوں کے اخلاقی وجود کی موت کے بعد زمین فساد سے بھر جاتی ہے۔ رشوت و بدعنوانی کا باعث یہی ہے۔ ظلم و ناانصافی اسی کی پیداوار ہے۔ خیانت و بددیانتی یہیں سے پھوٹتی ہے۔ ملاوٹ و جعل سازی اسی طرح جنم لیتی ہے۔ جھوٹ اور دروغ گوئی اسی کا نتیجہ ہے۔ غرض دنیا پرستی اخلاقی زندگی کی عمارت کے ہر ستون کو دیمک کی طرح کھا جاتی ہے۔ خاص طور پر نوجوان جو کسی بھی قوم کی امیدوں کا مرکز ہوتے ہیں اور بلند مقاصد کے لیے قربانی دینے میں سب سے آگے ہوتے ہیں، جب ان کی منزل صرف مادی منفعتوں کا حصول بن جائے تو اس سے بڑا سانحہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے ساتھ یہ سانحہ بھی ہو رہا ہے۔

ہوس زر کس طرح انسانی اخلاقیات کی دشمن ہے، اس کا اندازہ اس تنقید سے ہوتا ہے جو قرآن نے قریش کی قیادت پر کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

”لیکن یہ انسان، اس کا رب جب اسے آزماتا ہے، اور عزت بخشا اور نعمتیں عطا کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے۔ اور جب اسے آزماتا ہے اور اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر ڈالا، ہرگز نہیں، بلکہ (یہ سب تمھیں آزمانے کے لیے ہوتا ہے، مگر اس آزمایش سے بے پروا اس طرح زندگی بسر کرتے ہو کہ) یتیم کی قدر نہیں کرتے، اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کے لیے ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو اور (تمھارا یہ رویہ اس لیے ہے کہ تم) مال کی محبت میں متوالے ہوئے رہتے ہو۔“ (الفجر ۸۹: ۱۵-۲۰)

دنیا پرستی کے یہی وہ نتائج ہیں جس پر قرآن و حدیث اور انبیا کی تعلیمات میں شدید ترین تنقید کی گئی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

”جان رکھو کہ دنیا کی زندگی ـــــ لہو ولعب، زیب و زینت اور مال و اولاد کے معاملے میں باہمی فخر و مسابقت ـــــ کی مثال اس بارش کی ہے جس سے ہونے والی فصل کافروں کے دل کو موہ لے، پھر وہ پک جائے اور تم اسے زرد دیکھو، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ اور آخرت میں ایک عذاب شدید بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوش نودی بھی۔ اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کی ٹٹی ہے۔“ (الحدید ۵۷: ۲۰)

”لوگوں کی نگاہوں میں مرغوبات دنیا: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتی کھبا دی گئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ ان سے کہو: کیا میں تمھیں ان سے بہتر چیزوں کا پتا دوں؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن میں نہریں جاری

ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوش نودی ہوگی اور اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے۔'' (آل عمران ۳:۱۴۔۱۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس بات کی بڑی وضاحت فرمائی ہے۔فرمایا کہ ہلاک ہوا درہم اور دینار کا بندہ۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر دنیا کی اہمیت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دیتا۔ایک اور روایت میں فرمایا کہ ہر امت کا ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔

حضرت عیسیٰ نے دولت کے فتنے کے متعلق فرمایا:

''اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔''

(متی ۱۹:۲۳)

دنیا کی یہ مذمت اس لیے نہیں ہے کہ مال و دنیا اصلاً کوئی ناپسندیدہ شے ہے۔یہاں مذمت مال اور دنیا کی نہیں، بلکہ ہوس زر اور دنیا پرستی کے اس فتنہ کی ہو رہی ہے جس میں مبتلا انسان ہر اخلاقی حد کو پھلانگ جاتا ہے اور یہی چیز قابل مذمت ہے۔

۲۔منفی سوچ کا فروغ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اخلاقی انحطاط کی دوسری وجہ اس منفی سوچ کا فروغ ہے جو ہمارے ہاں بعض طبقات نے عام کر دی ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک مقتدر طبقات اور اشرافیہ غیر ملکی ایجنٹ ہیں۔یہی ملک کے تمام مسائل کی جڑ ہیں۔ہر فتنہ وفساد انھی سے جنم لیتا ہے۔ان کے خیال میں ان لوگوں سے ملک کو نجات دلا دی جائے تو ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔مسائل کی اس مقامی جڑ کے علاوہ انھیں ملک وملت کے ہر مسئلے کے پیچھے یہود و ہنود اور امریکہ و روس کی سازشیں بھی نظر آتی ہیں۔ان کے نزدیک ہمارے ساتھ دنیا بھر میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا واحد سبب یہی ہے کہ یہ ''کفار'' ہمارے دشمن ہیں اور ہمیں ہر میدان میں نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔چنانچہ کرنے کا اگر کوئی کام ہے تو یہی ہے کہ ان دشمنوں کو ملیامیٹ کر دیا جائے۔

قطع نظر اس کے کہ اشرافیہ، مقتدر طبقات اور بیرونی طاقتیں کیا کر رہی ہیں اور ان کے منفی طرز عمل سے نمٹنے کا درست طریقہ کیا ہے، جب یہ روش اختیار کی گئی تو عوام کی تربیت یہ ہوئی کہ ہر خرابی کی جڑ صرف دوسروں میں ہے۔اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دوسرے ٹھیک ہو جائیں۔جب ایسا ہوگا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔اس سوچ کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اپنی ذمہ داریاں فراموش کرنے لگے۔ان کی توجہ اپنے دائرے میں عائد شدہ ذمہ داریوں سے زیادہ دوسروں کے اس دائرے پر ہوگئی جس پر ان کا کچھ اختیار نہیں۔نتیجۃً لوگوں کے اپنے دائرۂ اختیار میں شر بڑھتا گیا، مگر اسے روکنے کے بجائے ان کی توجہ صرف دوسروں کی طرف مبذول رہی۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک عام آدمی نہ ملک کے مقتدر طبقات کی اصلاح کر سکتا ہے اور نہ بیرونی طاقتوں کے

خلاف لڑ کر حالات بدل سکتا ہے۔ بے بسی کے اس احساس کے تحت اس کے ذہن میں مایوسی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ مایوس آدمی ہمیشہ منفی طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ اس مایوسی میں لوگوں نے جب حکمرانوں کو بدعنوانی کا شکار دیکھا تو اسے اپنے دائرۂ اختیار میں برائی کرنے کا جواز سمجھ کر خود کو ہر اخلاقی بندھن سے آزاد سمجھنا شروع کر دیا۔

اس طرح کی منفی سوچ کے نتیجے میں بیرونی طاقتوں کی سازشیں ختم ہوئیں نہ اشرافیہ اور مقتدر طبقات کی اصلاح ہوئی۔ صرف یہ ہوا کہ عوام الناس اپنے اوپر عائد اخلاقی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی کرنے لگے۔ دوسروں کا ہر عیب اپنی غلطی کا ایک عذر بنتا چلا گیا۔ سسٹم کی وہ خرابی جو پہلے بالا دست طبقات تک محدود تھی اب گھر گھر پھیل گئی۔

اب ہر شخص کا ذہن کچھ اس طرح بن گیا ہے کہ میری خواہش ہے کہ ملک سے رشوت و بدعنوانی ختم ہو جائے۔ تاہم جب تک ایسا نہیں ہوتا میرے لیے رشوت لینا جائز ہے۔ سب لوگوں کو ٹریفک کے قوانین کی پابندی کرنی چاہیے، مگر جب تک ایسا نہیں ہوتا مجھے قانون کی خلاف ورزی کا حق ہے۔ تمام شہریوں کو اجتماعی اخلاقیات کی پابندی کرنی چاہیے، مگر جب تک ایسا نہیں ہوتا تو میں اپنے مفاد کے لیے کوئی بھی حد توڑ سکتا ہوں۔

لوگوں نے دیکھا کہ حکمران اور مقتدر طبقات کرپشن میں لتھڑے ہوئے ہیں تو انھوں نے بھی، جہاں موقع ملا، بہتی گنگا سے ہاتھ دھونا، بلکہ غسل کرنا ضروری جانا۔ انھیں کہیں انصاف نہ ملا تو انھوں نے دوسروں پر ظلم کرنے کو اپنے لیے جائز قرار دے دیا۔ اب یہی سوچ کر ایک کلرک اور کانسٹیبل رشوت لیتا ہے کہ اسے تنخواہ کم مل رہی ہے۔ یہی سوچ کر ایک دکان دار ملاوٹ کرتا اور کم تولتا ہے کہ اس کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ اسی فکر کے پیش نظر ایک غریب دوسرے غریب کا حق اسی طرح مارتا ہے جس طرح کوئی طاقت ور کسی کم زور کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔

لوگوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ امریکہ، برطانیہ، اسرائیل اور بھارت کے ظلم کا رونا روتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے ہم قوم و ہم مذہب لوگوں کے حقوق پامال کرتے جاتے ہیں۔ تیز رفتار گاڑی چلا کر لوگوں کو مار ڈالنے والے ڈرائیور، کھلے عام رشوت لینے والا ٹریفک کا سپاہی، بدعنوان سرکاری اہلکار، بددیانت تاجر اور ان جیسے دیگر جیتے جاگتے کردار امریکہ و بھارت کے بدترین ناقد بھی ہوتے ہیں۔ یہ فوج اور سیاست دانوں کی کرپشن کا گلہ بھی کرتے ہیں، مگر اپنے دائرۂ اختیار میں یہ سب اتنے ہی بڑے ظالم ثابت ہوتے ہیں۔ اس ظلم کے خلاف اپنے اندر سے جو آواز اٹھتی ہے، اسے دبانے کے لیے وہ اسی منفی سوچ کا سہارا لیتے ہیں کہ اس حمام میں جہاں سب ننگے ہو چکے ہیں، ہمارے لیے بھی اخلاقیات کا لباس اتارے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اس رویے کا سب سے برا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ظلم و بدعنوانی جس کا الزام اشرافیہ اور غیر ملکی طاقتوں پر عائد کیا جا رہا تھا، اس میں تو کوئی کمی نہیں آئی، البتہ ایک عام آدمی کی زندگی اسی جیسے عام آدمی نے جہنم بنا دی ہے۔ اب تو صورت حال یہ ہو چکی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہے کہ سوسائٹی میں پھیلی بداخلاقی، ظلم اور بدعنوانی کا شکار ہونے والے اکثر لوگ کسی بڑے آدمی کے نہیں، بلکہ اپنے ہی جیسے عام آدمیوں کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ سب نتیجہ ہے اس سوچ کا جس میں اپنی جواب دہی کے بجائے دوسروں کی جواب دہی یاد رکھی جاتی ہے۔ جس میں اپنے دائرے کے بجائے دوسروں کے دائرۂ اختیار پر زور ہوتا ہے۔ جس میں اصلاح کا مطلب صرف دوسروں کی اصلاح ہوتا ہے، حالانکہ دین نے ہمیں جو تعلیمات دی ہیں، وہ بالکل برعکس ہیں۔ حدیث میں بالصراحت حکم دیا گیا ہے کہ جب تمھارے حکمران برے ہو جائیں تو اسے تمھاری برائی کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ وہ تمھارے حقوق دیں یا نہ دیں تمھیں اپنے فرائض ہر حال میں پورا کرنے ہیں۔ ان کی کمائی کا وبال ان پر پڑے گا اور تم اپنے کاموں کے ذمہ دار ہو۔ بلاشبہ یہ بات حکمت نبوی کا شاہ کار ہے جس کی خلاف ورزی کے نتائج آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر احادیث میں بھی امرا کے بگاڑ پر صبر اختیار کرنے اور اپنے دائرے میں اصلاح کرنے کا حکم دیا ہے۔

قرآن نے یہ حکیمانہ بات اپنے انتہائی بلیغ اسلوب میں اس طرح فرمائی ہے:

> ''اے اہل ایمان تم اپنی فکر رکھو۔ اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا، وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے تو وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔'' (المائدہ۵: ۱۰۵)

جہاں تک اغیار کی سازشوں کا تعلق ہے تو صحابہ کو اسی طرح کی صورت حال کے پیش آنے پر اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا تھا وہ ہم قارئین کے سامنے رکھنا چاہیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> ''اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کی چال تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں، بے شک اللہ اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔'' (آل عمران۳: ۱۲۰)

ان احکامات سے ظاہر ہے کہ دین کا زور اس پر ہے کہ تمھاری بنیادی ذمہ داری اپنی اصلاح ہے۔ دوسروں کا بگاڑ کبھی تمھارے بگاڑ کا جواز نہیں بن سکتا۔ اگر برائی پھیل جائے تب بھی تمھیں صبر سے کام لینا ہوگا۔ دین کے اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ جب افراد کی اکثریت اپنی اصلاح پر زور دے گی تو اس کے نتیجے میں کسی اقلیت کا بگاڑ اکثریت کے بگاڑ کا سبب نہیں بنے گا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک عام آدمی جس کی زیادہ تر زندگی اپنے جیسے عام آدمیوں کے درمیان گزرتی ہے، کبھی عام آدمی کے ظلم کا شکار نہیں ہوگا۔ ظلم کرنے والے طبقات بہت کم ہوتے ہیں۔ ان کی برائی کا اثر بھی محدود ہوتا ہے، مگر جب بگاڑ عوام الناس میں پھیلتا ہے تو پوری سوسائٹی ظلم و فساد سے بھر جاتی ہے۔ ٹھیک یہی کچھ اس وقت ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔

۳۔ ظاہر پرستی

ہم ابتدا میں بیان کر چکے ہیں کہ اخلاقی اقدار کا شعور ہر انسان اپنے ساتھ ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے۔ دنیا میں آنے والا ہر انسان، مدرسۂ فطرت سے، اخلاقیات کے میدان میں فارغ التحصیل ہو کر آتا ہے۔ اسی بنیاد پر قیامت کے دن

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس کے اعمال کی جانچ ہوگی۔ تاہم انسان اپنی بعض کمزوریوں کے باعث انحراف کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ انسانوں میں پیدا ہونے والے اس بگاڑ کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے انبیا اور رسول دنیا میں بھیجے ہیں جو لوگوں کو واپس فطرت کے راستے کی طرف بلاتے ہیں۔

انبیا کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف لوگوں کی بداعمالیوں پر انھیں تنبیہ کرتے اور صحیح راستے کی طرف ان کی رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ جو لوگ ان کی بات مان لیتے ہیں، ان کو راہ راست پر رکھنے کے لیے کچھ اعمال مقرر کرتے ہیں۔ یہ اعمال دین کا ظاہری ڈھانچا تشکیل دیتے ہیں۔ یہ ظاہری ڈھانچا اپنی جگہ عین مطلوب ہوتا ہے، مگر جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس کا اصل مقصد لوگوں کو شاہ راہ فطرت پر قائم رکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین کے ہر ظاہری حکم کا کوئی نہ کوئی نتیجہ اخلاق اور فطرت کی دنیا میں نکلتا ہے۔ مثلاً خدا کو تنہا معبود اور سب سے بڑا ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اور سوائے اچھے عمل کے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ نماز ایک طرف خدا کی یاد ذہن انسانی میں زندہ رکھتی ہے تو دوسری طرف فواحش و منکرات سے روکنا بھی اس کی خاصیت ہے۔ روزہ اگر خدا کی نعمتوں کی قدر و قیمت کا احساس دلاتا ہے تو ساتھ ساتھ خدا کے حدود کی پابندی کی تربیت اور غربا و مساکین کے حالات کی طرف بھی انسان کی توجہ دلاتا ہے۔ زکوٰۃ خدا سے محبت کے ساتھ مال و دنیا سے بے رغبتی اور ضعفا کی مدد کا بھی ذریعہ ہے۔ حج و عمرہ خدا کے شوق کو بھڑکاتا ہے تو ساتھ ساتھ اس اجتماعی زندگی کی تربیت بھی کرتا ہے جس میں لوگ تکلیف دہ حالات کے باوجود اپنے اوپر قابو رکھتے اور ایک دوسرے کا خیال کرتے ہیں۔

انبیا کی یہ تعلیمات اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بے حد موثر ہیں، مگر امتوں پر جب زوال کا دور آتا ہے تو ان کی تمام تر توجہ دین کے ظاہری ڈھانچے کی طرف ہو جاتی ہے۔ خدا پرستی اور اتباع شریعت کا معیار کچھ ظاہری اعمال بن جاتے ہیں۔ علامتی چیزوں کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا جاتا ہے۔ دین کا ظاہری ڈھانچا جو اصلاً دین داری کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے، دین کا آخری مطلوب قرار دے دیا جاتا ہے۔

اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ دین کے اس سادہ ظاہری ڈھانچے میں لوگ اپنی طرف سے طرح طرح کے اضافے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی ساری تگ و دو اور دلچسپی کا مرکز اگر کوئی چیز رہ جاتی ہے تو یہی فروعی اور اضافی چیزیں ہیں جن کی کوئی نظری یا عملی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس صورت حال کا ایک زیادہ برا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ دین کے ظاہری ڈھانچے سے حاصل ہونے والے اخلاقی نتائج کو یک سر فراموش کر دیتے ہیں۔ شریعت کے احکامات سے وابستہ مقاصد جن کا ظہور اخلاقی سطح پر مطلوب ہے، وہ معاشرے کا موضوع ہی نہیں رہتے اور نہ کسی کو ان کے پیدا کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ نتیجۃً لوگوں کی اخلاقی حس مردہ ہونے لگتی ہے۔ لوگ دین کے تمام ظاہری اعمال کی پابندی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر عین اس کے ساتھ اخلاقی سطح پر وہ بدترین انسان ثابت ہوتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس کا سبب یہ ہے کہ دین کا ظاہری ڈھانچا مشکل سہی، مگر ایک دفعہ اسے اختیار کرنے کے بعد یہ انسان کی عادت میں شامل ہو جاتا ہے۔ جس کے بعد اس پر جمے رہنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ دوسری طرف بعض لوگ اس طرح کے ظاہری اعمال پر نجات کا فتویٰ دے دیتے ہیں۔ چنانچہ کوئی بھی شخص اخلاق کی بلند و مشکل گھاٹی کو عبور کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ اور کرے بھی تو کیوں کرے؟ جب جنت بغیر کسی مشکل کے آسانی سے مل رہی ہے تو اخلاقیات کی اس کانٹوں بھری راہ گزر پر کون قدم رکھے جس میں قدم قدم پر اپنے اندر اور باہر لڑنا پڑتا ہے۔ چنانچہ لوگ ڈاڑھی ٹوپی، نماز روزے اور حج و عمرے کو محض رسوم کے طور پر اختیار کرتے اور اس کے بعد اپنی دانست میں اخلاقی دنیا کی ہر پستی میں اترنے کا جواز قائم کر لیتے ہیں۔ اسی صورت حال کا نتیجہ ہے کہ معاشرے میں ایک نیک مسلمان کی حیثیت سے معروف شخص بھی آج اسی اخلاقی پستی کا شکار ہے جس کا گلہ ایک دنیا دار شخص سے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں خیال رہے کہ ہماری تنقید دینی عبادات پر نہیں، بلکہ ان میں غیر ضروری اضافے اور ان کے مقاصد سے بے پروائی اختیار کرنے پر ہے۔ عبادات کا یہ ظاہری ڈھانچا تو خود اللہ اور اس کے رسولوں نے مقرر کیا ہے اور بلاشبہ کسی معجزے سے کم نہیں۔

نزول قرآن کے وقت اہل کتاب نے قبلہ کی جو بحث اٹھائی تھی، اس پر انھیں تنبیہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ نیکی مشرق و مغرب کی طرف سمت کرنے کا نام نہیں، بلکہ ایمان و اخلاق کے تقاضے پورے کرنے کا نام ہے۔ ظاہر پرستی پر زیادہ تفصیلی تنقید ہمیں انجیل میں ملتی ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل اپنے دور زوال میں بری طرح اس مرض میں گرفتار تھے۔ وہ معمولی ظاہری اعمال پر تو خوب زور دیتے تھے، مگر بڑے بڑے اخلاقی احکام کے معاملے میں ان پر غفلت طاری تھی۔

ایسے میں ان کی طرف سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ آپ نے جس شدت سے بنی اسرائیل کی ظاہر پرستی اور اخلاقی دیوالیے پن پر تنقید کی ہے، اسے انجیل میں جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم سیدنا عیسیٰ کی ایک تقریر کا اقتباس پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں، جس سے اس مرض کی انتہا اور اس کے بدترین اخلاقی نتائج کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی خط کشیدہ الفاظ میں ہم نے اس مسئلے کا وہ حل بھی واضح کر دیا ہے جو سیدنا مسیح نے بیان فرمایا ہے:

> ''اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھتے ہو اور دکھاوے کے لیے نمازوں کو طول دیتے ہو، تمھیں زیادہ سزا ہو گی... اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دہ یکی (یعنی عشر) دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو، جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو، مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں۔ اے اندھے فریسی پہلے پیالی اور رکابی کو اندر سے صاف کر تا کہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوب صورت دکھائی دیتی ہیں، مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو، مگر باطن میں بے دینی اور ریاکاری سے بھرے ہو۔‘‘ (متی ۲۳: ۱۴۔ ۲۸)

۴۔ اجتماعی نصب العین کی غیر موجودگی

اخلاقی انحطاط کا چوتھا سبب قومی زندگی میں کسی اجتماعی نصب العین کی عدم موجودگی ہے۔ اخلاقی زندگی اصلاً قربانی کی زندگی ہے۔ انسان عام حالات میں خود پرستانہ اور ذاتی مفادات پر مبنی زندگی گزارتے ہیں۔ ایسا کرنا ان کے لیے ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے، مگر جب سامنے کوئی بلند تر مقصد ہو تو انسان دوسروں کی خاطر دکھ جھیلتا اور ایثار کرتا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال ایک خاندان اور بچوں کے لیے ماں اور باپ کی قربانیاں ہیں۔ یہ دونوں اگر اپنے بہت سے حقوق سے دست بردار ہو کر اپنا مال، وقت اور محبت بچوں کو نہ دیں اور ان کے لیے مشکلات کا سامنا نہ کریں تو کبھی کوئی خاندان وجود میں نہیں آ سکتا۔

ٹھیک یہی معاملہ ایک معاشرے کا ہوتا ہے۔ ایک مضبوط قوم اور مستحکم معاشرہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب افراد کسی خارجی دباؤ کے بغیر خود اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر لیں۔ خاندان کے معاملے میں تو یہ چیز اس لیے با آسانی حاصل ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی جبلت میں اولاد کی بے پناہ محبت ڈال رکھی ہے، مگر قوم کے معاملے میں لوگ ایسا صرف اس وقت کرتے ہیں جب ان کے سامنے اپنی ذات سے بلند تر کوئی اجتماعی مقصد اور نصب العین ہوتا ہے۔

ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر کوئی ایسا مقصد ہمارے سامنے نہیں۔ دوسری اقوام اس مسئلہ کو قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبے سے حل کرتی ہیں۔ ان کی زبان ایک ہوتی ہے، ان کی تاریخ ایک ہوتی ہے، ان کی تہذیب و ثقافت ایک ہوتی ہے، ان کی نسل ایک ہوتی ہے، ان کا جغرافیہ ایک ہوتا ہے۔ یک جہتی کی اتنی بنیادوں کے بعد ان میں اپنی ایک انفرادی قومی شناخت کا بھرپور احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس کی بقا، تحفظ اور فروغ کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ قوم میں اجتماعی اخلاقیات کی وہ روح پیدا ہوتی ہے جس میں ہر شخص خوش دلی سے اپنے اوپر عائد ذمہ داریوں کو بلا اکراہ و جبر پورا کرتا اور اجتماعی مفاد کی خاطر انفرادی مفاد کو پیچھے ڈال دیتا ہے۔

جہاں یہ بنیادیں کمزور ہوں، وہاں ان کے دانش وران میں اجتماعیت کا وہ احساس پیدا کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے مفادات ایک ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیڈر سوسائٹی کے ہر طبقہ کے مفادات کو یکساں اہمیت دیتے اور ان کے حقوق و فرائض کے تعین میں کسی ناانصافی اور ظلم سے کام نہیں لیتے۔ جس کے بعد تھوڑا وقت گزرتا ہے اور قوم پرستی کا احساس افراد قوم کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ افراد قوم اپنی انفرادی شناخت بھلا کر خود کو اجتماعیت میں ضم کر دیتے ہیں۔ اس عمل سے نکلنے والا نتیجہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

دوسری طرف ہماری صورت حال یہ ہے دور جدید میں اجتماعیت کی وہ بنیادیں جن پر قوم کی بنا رکھی جاتی ہے، ہم ان

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سے محروم ہیں یا ان کو پامال کر کے ہم نے اپنے لیے وطن حاصل کیا ہے۔آزادی کے وقت ہماری زبان،نسل، تاریخ، تہذیب وثقافت اور جغرافیہ، کچھ بھی ایک نہیں تھا۔ایسے میں لازمی تھا اور ہے کہ ہم اپنے قومی وجود کی تعمیر کے لیے کم ازکم ایک اجتماعی بنیاد تلاش کرتے۔ جو خوش قسمتی سے اسلام کی صورت میں ہمیں پہلے ہی سے حاصل تھی۔

ایسے میں ضروری تھا کہ نعروں کے بجائے تعلیم کے ذریعے سے اسلامی تصورات کو ذہنوں میں راسخ کیا جاتا اور اقتدار اور حکومت کے بجائے معاشرے میں اسلام کے فروغ کو ہدف بنایا جاتا۔ بالخصوص معاشرے کے وہ فعال طبقات جو اصلاً معاشرہ کی سمت اور رفتار کو کنٹرول کرتے ہیں ان کے سامنے اسلام اور شریعت اسلامی کا درست چہرہ سامنے لایا جاتا اور ان کے ذہنوں کو اس کی علمی برتری سے مرعوب کیا جاتا۔ بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا اور آج تک ایسا نہیں ہورہا۔اس کے بجائے فرد اور حکومت کی سطح پر چند نمایشی اقدامات اور ظاہری تبدیلی کو مطلوب قرار دے دیا گیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اسلام ہماری زندگیوں میں کوئی فعال کردار ادا نہیں کرتا اور اس کی بنیاد پر ایک اجتماعیت کے فروغ کے امکانات دن بدن مدھم پڑتے چلے جارہے ہیں۔ مذہب کا کوئی استعمال اب بچا ہے تو ظاہر پرستی کی اس شکل میں جس پر ہم پیچھے روشنی ڈال چکے ہیں۔

ہمارے جیسی ایک تاریخی قوم جو مختلف گروہوں کے اشتراک سے وجود میں آئی ہے اور جو فطری قومی بنیادوں سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے بھی ایک زبردست تقسیم کا شکار ہے، اس کی بقا کے لیے ضروری تھا کہ اس کے مختلف گروہوں اور طبقات کے حقوق وفرائض کا تعین عدل وانصاف کے ساتھ کیا جاتا۔ پھر وقتاً فوقتاً ان پر نظر ثانی کا سلسلہ جاری رہتا، مگر ہم اس میدان میں بھی مکمل طور پر ناکام رہے۔ جس کا ایک نتیجہ ہم نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں بھگت لیا۔ہم نے اپنی روش نہ بدلی تو نجانے مزید کیا کیا سامنے آئے گا۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ابھی تک اپنی قومی بنیادوں ہی کو متعین نہیں کرسکے۔کبھی سارے جہاں کا درد ہمارے دل میں سما جاتا ہے اور کبھی سب سے پہلے ہمیں اپنی جان کی پڑ جاتی ہے۔ہم خود کو دائرۂ اسلام کا مکیں بتاتے ہیں، مگر عملاً ہمارا ہر دائرہ صوبائی سرحدوں اور لسانی حدبندیوں تک محدود ہے۔ہمیں اپنے مسلمان ہونے پر اصرار ہے، مگر اس کے ساتھ اپنی فرقہ دارانہ شناخت پر بھی ہمیں فخر ہے۔ ہمارا قومی کلچر کیا ہے، ہمیں نہیں معلوم۔ ہمارا ثقافتی چہرہ کیا ہے، ہم نہیں جانتے۔من حیث القوم ہماری کوئی منزل نہیں۔ فی الوقت ہماری اجتماعیت مغربی، ہندوستانی اور زوال یافتہ مسلم تہذیب اور مقامی ثقافت کا ایک ایسا ملغوبہ ہے جس کی کوئی متعین شکل پچاس سال میں سامنے نہیں آسکی۔ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آزادی کے نصف صدی بعد بھی ہمارا کوئی متفقہ قومی شعور اور کلچر وجود پزیر نہیں ہوسکا۔تو پھر سوال یہ ہے کہ فرد کس قوم کے لیے انفرادی مفاد کی قربانی دے۔ یہ بات اس لیے بھی بڑی اہم ہے کہ معاشرہ صرف قانون کے سہارے نہیں چلایا جاسکتا۔ قانون تو چند مجرمانہ ذہنیت کے لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ہوتا ہے، جبکہ عام لوگ اجتماعی مفاد کی خاطر ایک روایت کے طور پر قانون واقدار کی پابندی کرتے ہیں، مگر ہمارے ہاں کسی برتر اجتماعی نصب العین کے نہ ہونے کی بنا پر لوگ اپنی ذات

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اور مفاد سے آگے دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ لہٰذا ہمارا ہر گھر، ہر سڑک، ہر دفتر اور ہر فیکٹری اجتماعی اخلاقیات کے اصولوں کی بھرپور خلاف ورزی کا نمونہ بن چکی ہے۔

مسئلہ کا حل کیا ہے؟

یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جو ہمارے اخلاقی انحطاط کے پیچھے کارفرما ہیں۔ جب تک ہم ان وجوہات کو دور نہیں کریں گے، اس وقت تک اخلاقی انحطاط کا یہ کینسر ہمیں اندر ہی اندر کھاتا رہے گا اور ایک روز ہمیں کسی بڑی تباہی سے دوچار کر دے گا۔

ہمارے نزدیک اس مسئلے کے حل کے دو پہلو ہیں۔ ایک فکری اور دوسرا عملی۔ انسان کے متعلق یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ حیوانات سے بلند تر ایک مخلوق ہے۔ اس برتری کا باعث قلب و نظر کی وہ صلاحیتیں ہیں جو حیوانی جبلتوں کے ساتھ اسے عطا کی گئی ہیں۔ انسان سے صادر ہونے والے تمام اعمال، خواہ وہ جبلی تقاضوں سے متعلق ہوں، قلب و ذہن کی بارگاہ سے اجازت طلب کر کے ہی دنیا میں ظہور پزیر ہوتے ہیں۔ اس لیے بگاڑ جب بھی آتا ہے، وہ اولاً فکری طور پر آتا ہے اور پھر عملی دنیا میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا تجزیے میں دیکھا کہ اخلاقی بگاڑ کے چاروں اسباب فکری سطح پر غلط نقطۂ نظر کے فروغ اور درست نظریہ کی عدم موجودگی سے پیدا ہوئے ہیں۔

چنانچہ اصلاح کی راہ پر پہلا قدم یہ ہے کہ ایک فکری اساس متعین کی جائے جو مذکورہ بالا اسباب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس کے ساتھ عام لوگوں کے لیے اس عملی لائحۂ عمل کی نشان دہی بھی ضروری ہے جسے اختیار کر کے وہ اس صورت حال کے خاتمے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اس لیے کہ یہ اخلاقی بگاڑ عوام الناس تک سرایت کر گیا ہے اور جب تک وہ عملاً اصلاح احوال کے لیے پوری قوت سے کوشش نہیں کریں گے کسی اور کے اصلاحی اقدامات کے نتیجے میں صورت حال میں بہتری کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

اصلاح کی فکری اساس

جہاں تک درست فکری اساس کا سوال ہے تو ہمارے نزدیک یہ اس مقصد کا صحیح شعور ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں مسلمانوں کو اس لیے پیدا نہیں کرتے کہ اسے کچھ نہ کچھ لوگوں کی تو بہر حال ضرورت ہے جو اس کی جنت کو ویران ہونے سے بچا سکیں۔ وہ کردار و اخلاق کا بدترین نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں اور اللہ تعالیٰ اس کے باوجود انھیں فردوس کے باغوں میں آباد کر دیں۔ امت مسلمہ سے جو چیز اصلاً مطلوب ہے، وہ دنیا کے سامنے ایک خدا پرستانہ معاشرے کا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا نمونہ پیش کرنا ہے۔ مسلمانوں کا یہ معاشرہ توحید سے وفاداری اور شریعت کی پاس داری کے اصول پر قائم ہوتا ہے۔ یہی وہ فکری اساس ہے جس کا صحیح ادراک پیدا ہونے کے بعد مذکورہ بالا چاروں منفی اسباب ختم ہو جاتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

توحید پرست فرد دنیا پرست نہیں ہوسکتا۔اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اپنے رب کو راضی کرنا اور جنت کی اس ابدی بادشاہی کا حصول ہوتا ہے جس میں داخلے کی شرط یہی ہے کہ فرد اپنے وجود کو اخلاق و کردار کی ہر گندگی سے پاک کر کے اپنے رب کے حضور پیش ہو۔اس کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی خدا پرست اپنے آپ کو دنیا کی عارضی نعمتوں کی خاطر ان اخلاقی برائیوں سے آلودہ کرے جو اسے ابدی جنت سے دور کر دیں گی۔

آخرت کی کامیابی کا یہ نصب العین انسان کی نفسیات پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔انسان اپنے اندر ہمیشہ کی زندگی اور ابدی بادشاہی کی جو طلب پاتا ہے، جنت اور اس کی نعمتیں آخری درجے میں اسی تصور کا جواب ہیں ۔ جنت کا حسن و جمال، اس کی رعنائی و دل کشی ،سکون و راحت ، سرور و لذت ،توقیر و عزت ، وسعت و رحمت ، عطا و نعمت ، خوشی و مسرت ، آسانی و فراغت ، دوام و ابدیت اور بخشش و عافیت کے تصورات جب قلب انسانی میں راسخ ہو جاتے ہیں تو اس کے لیے وہ اخلاقی زندگی گزارنا بے حد آسان ہو جاتا ہے جو سر تا سر قربانی سے عبارت ہے۔ بالکل اس طالب علم کی طرح کہ کامیابی کی امید جس کے لیے امتحان کی ہر شدت کو آسان اور تیاری کے ہر مرحلے کو سہل بنا دیتی ہے۔

ایسا انسان آخرت کی اس کامیابی کے لیے شریعت پر اس کی صحیح روح کے ساتھ عمل کرتا ہے۔شریعت کا صحیح علم اسے ظاہر پرستی سے بچاتا اور دین کی ترجیحات سے آگاہ کرتا ہے۔ سچی شریعت بتاتی ہے کہ اعمال میں اصل اہمیت تعداد سے زیادہ اخلاص کی ہے۔ جزئیات سے زیادہ اصول کی ہے۔شریعت کا ہر عمل اور دین کا ہر حکم اخلاقی دنیا میں اپنا ایک نتیجہ چاہتا ہے۔ جو اگر نہ نکلے تو پھر خدا کی بارگاہ میں اس کی قبولیت مشکوک ہے۔ دین و شریعت ایک بندۂ مومن کو قدم قدم پر بتاتے ہیں کہ بندوں کے حقوق مار کر رب کو راضی نہیں کیا جا سکتا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پھر جن لوگوں کی زندگی کا مقصد توحید اور اس کا فروغ ہو، وہ دوسروں کی ''سازشوں'' کے پرچار کے بجائے ان تک حق پہنچانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کے فرائض انھیں یاد دلانے کے بجائے اپنی ذمہ داریاں یاد رکھتے ہیں۔ وہ ان سے دنیوی امور پر جھگڑے کھڑے کرنے کے بجائے ان کی آخرت کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ وہ نفرت کے بجائے خیر خواہی اور ذمہ داری کے اس احساس میں جیتے ہیں جو انبیا کا خاصا ہے۔ وہ لوگوں کی زیادتیاں سہہ کر انھیں اپنا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر توحید کی شکل میں قوم کو وہ اجتماعی نصب العین حاصل ہو جاتا ہے جس کے فروغ کا ارفع مقصد قوم کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ہم جیسے بے مقصد و بے منزل گروہ کی ایک قوم بننے کی واحد امید اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ ہم توحید کے فروغ کو اپنا مشن بنا لیں۔توحید و شریعت سے سچی وابستگی نہ صرف ہمارے اخلاقی مسائل کا حل ہے، بلکہ بے راہ روی اور دنیا پرستی پر مبنی مغربی تہذیب کو دنیا میں جو فروغ حاصل ہو رہا ہے، اس کے بعد ہم پر لازم ہے کہ ہم توحید اور آخرت کا مشن لے کر میدان عمل میں اتر آئیں۔ اس کو اپنے شعور میں آخری حد تک پختہ کریں اور دنیا پرستی کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو بلا شبہ ہم بارگاہ احدیت کے مجرم قرار پائیں گے۔

اصلاح کا عملی طریقہ

ہم نے پیچھے جو کچھ بیان کیا اس کے حصول کا عملی ضابطہ بھی دین نے خود ہی بیان کیا ہے۔ اصلاح معاشرہ کے اس ضابطے کے تین بنیادی عناصر ہیں۔ ریاست، علما اور فرد۔ ہم اس تحریر میں صرف فرد سے متعلق دیے گئے طریقۂ کار پر گفتگو کریں گے، کیونکہ وہی ہمارا مخاطب ہے۔ نیز اس دور میں اصلاح معاشرہ سے متعلق فرد کی ذمہ داریوں کے بارے میں افراط وتفریط کا رویہ عام ہو گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں عام لوگوں پر ان کی استعداد سے زیادہ بوجھ ڈالا جاتا ہے اور پھر بھی مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔ اس لیے فرد کو اس کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں باشعور بنانا ضروری کام ہے۔

ایک عام فرد سے، عام حالات میں جو دینی مطالبات لازماً مطلوب ہیں، وہ قرآن کریم کی سورۂ عصر میں اس طرح بیان کیے گئے ہیں:

”زمانہ گواہی دیتا ہے کہ یہ انسان خسارے میں پڑ کر رہیں گے۔ ہاں، مگر وہ نہیں جو ایمان لائے، اور انھوں نے نیک عمل کیے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کی“۔ (۱۰۳: ۱۔۳)

قرآن کریم کی یہ سورت واضح طور پر یہ بتاتی ہے مذکورہ بالا اعمال خسارے سے بچنے کا یقینی ذریعہ ہیں۔ بلا شبہ یہ خسارہ آخرت کا ہے، مگر ایک مسلمان گروہ کے لیے یہ اعمال دنیا میں بھی نجات کے ضامن ہیں۔ اس مضمون میں ایمان اور عمل صالح ہمارا موضوع نہیں۔ البتہ تواصو بالحق وتواصو بالصبر (یعنی ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور حق پر ثابت قدمی کی تلقین کرنا) کے حکم پر ہم تفصیل سے گفتگو کرنا چاہیں گے۔

تواصو بالحق اور تواصو بالصبر کی اہمیت

اس حکم کی اہمیت کو جاننے کے لیے اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ معاشرے میں برائیاں اس وقت پھیلتی ہیں جب لوگ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے پروا ہو کر زندگی گزارنا شروع کر دیتے ہیں۔ انسان اپنی زندگی تنہا کسی کھوہ، جنگل یا غار میں نہیں گزارتا، بلکہ لوگوں کے درمیان ایک خاندان کی صورت میں رہتا بستا ہے۔ وہ جب کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے دوست، احباب، اہل خانہ اور متعلقین اس بات سے بے خبر رہ جائیں۔ ایسے میں اس شخص کے قریبی حلقے کے لوگ اگر اس برائی کے ارتکاب پر اسے فوراً ٹوک دیں تو اس کے رجوع کرنے اور لوٹنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں، لیکن اس کے برخلاف اگر یہ لوگ اس کی بدعملی کو معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیں یا اس کے شریک کار اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے والے بن جائیں تو ایسا شخص اطمینان کے ساتھ بدترین جرائم کا ارتکاب کرتا چلا جائے گا اور اسے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

احساس تک بھی نہ ہوگا۔

ہمارے معاشرے میں جب ایک شخص رشوت لیتا ہے تو اکثر وبیش تر اس کے گھر والے اس بات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اگر حرام کے اس پیسے کو قبول کرنے سے انکار کر دیں، اسے سمجھائیں کہ یہ پیسہ نہیں، جہنم کے انگارے اور سانپ اور بچھو ہیں تو کسی بھی رشوت خور کے لیے اس پیسے کو گھر لے جانا بہت مشکل ہوگا۔ اس کے برخلاف جب گھر والے اپنے مفادات کی خاطر اس گناہ پر آنکھیں بند کر لیتے ہیں تو معاشرے پر ایک ظالم اور بدعنوان شخص مستقل طور پر مسلط ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھی اہلکار اور ماتحت اسے روکنے کے بجائے اسے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو یہیں سے اس اخلاقی بگاڑ کا پورا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی بہت کچھ تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

اس پس منظر میں آپ ''تواصو بالحق وتواصو بالصبر'' کے اس حکم کی اہمیت کو سمجھیں جس کے تحت ایک شخص جب دوسروں کو حق سے دور دیکھتا ہے تو اسے اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے اور جب کوئی فرد کسی بنا پر حق کو چھوڑنے لگتا ہے تو وہ اسے اس حق پر ڈٹے رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس حکم کا لازمی نتیجہ ہے کہ زندگی میں پہلی دفعہ رشوت لینے والے کے دوست، احباب اور متعلقین میں سے کوئی نہ کوئی اسے ٹوک دے گا۔ کسی قریبی آدمی کا برائی پر اس طرح ٹوکنا کوئی معمولی بات نہیں۔ ہر شخص اپنے قریبی لوگوں میں، جن میں وہ زندگی گزارتا ہے، صاحب عزت وشرف بن کر رہنا چاہتا ہے۔ ان کی نصیحت اور فہمایش سے اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ برائی کی طرف اٹھنے والے اس کے قدم کمزور پڑ جائیں گے۔ کچھ نہ بھی ہو تو کم از کم برائی اس کی نظر میں برائی کے طور پر زندہ رہے گی۔ یہی احساس ایک دن اسے توبہ پر آمادہ کر دے گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تواصو بالحق وتواصو بالصبر ایک لازمی حکم

''تواصو بالحق وتواصو بالصبر'' کے حکم کے متعلق یہ بات جان لینی چاہیے کہ دین کا یہ حکم ایک مسلمان کی لازمی ذمہ داریوں میں سے ہے جو ایمان وعمل صالح کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ قرآن وحدیث میں جگہ جگہ اس ذمہ داری کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی گئی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی تشریح کرتے ہوئے ایک دوسری تعبیر بھی اختیار کی ہے جسے ہم عام طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام سے جانتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک دوسرے کو نیکی کی نصیحت کرنا اور برائی سے روکنا ہر صاحب ایمان مرد وعورت کا لازمی وصف ہے۔ سورۂ توبہ میں اس بات کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> ''اور مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ باہم دگر بھلائی کی نصیحت کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔'' (۹:۷۱)

تواصو بالحق وتواصو بالصبر: چند اہم نکات

دین کے اس بنیادی حکم پر عمل کرتے ہوئے چند باتیں واضح رہنی چاہییں۔ پہلی یہ کہ نماز روزے کی طرح اس حکم کے

کوئی مخصوص اوقات متعین نہیں، بلکہ ایک مسلمان کو اس فریضے کی ادائیگی کے لیے ہمیشہ ذہناً تیار رہنا چاہیے۔ جب کبھی حق سے کوئی انحراف اس کے سامنے آئے تو ضروری ہے کہ وہ کسی مفاد یا اندیشہ کی پروا کیے بغیر اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ عمل دوطرفہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک وقت میں اگر ایک آدمی دوسرے کو کسی حق کی تلقین و نصیحت کر رہا ہے تو کسی اور وقت میں دوسرا پہلے کی توجہ اس کی کسی کوتاہی کی طرف دلا سکتا ہے۔ آج ایک شخص کی کسی برائی کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے تو کل یہی شخص دوسرے کو اس کی غلطی پر نصیحت کرے گا۔ اس طرح مسلم معاشرہ کا ہر شخص دین و اخلاق پر عمل کرنے والا بھی بن جاتا ہے اور اس کی رکھوالی کرنے والا بھی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ کسی معاشرے میں برائی کو پھیلنے سے روکنے کا اس سے زیادہ موثر ذریعہ کوئی نہیں ہوسکتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ کام اصلاً اپنے ماحول اور حلقے میں کرنے کا ہے۔ یعنی اس کام میں انسان کا دائرۂ عمل وہ ہے جہاں وہ خود بنفس نفیس موجود ہوتا ہے۔ یعنی اس کا گھر، دفتر، دوست، محلّہ وغیرہ۔ اس میں کوئی خیر نہیں کہ ایک انسان دنیا بھر میں تو نیکی کو عام کر رہا ہو، مگر اس کا اپنا قریبی حلقہ اس کے فیض سے محروم رہ جائے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس حلقے میں بھی جو جتنا قریب ہوگا، اسی قدر یہ ذمہ داری زیادہ ہوگی۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ انسان سے سب سے قریب اس کے گھر والے ہوتے ہیں جن میں اس کے وقت کا بیش تر حصہ بسر ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے گھر والوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے انسان کو سب سے زیادہ حساس ہونا چاہیے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ جس قریبی حلقے اور ماحول کو انسان کا دائرۂ عمل قرار دیا گیا ہے، وہیں اس کا ایک دائرۂ اختیار بھی ہوتا ہے۔ مثلاً شوہر کے لیے بیوی اور ماں باپ کے لیے اولاد وغیرہ۔ چنانچہ اس دائرے کے بارے میں ہدایت دی گئی ہے کہ یہاں انسان اپنا اختیار استعمال کر کے ہر منکر کو روکنے کی کوشش کرے۔ یہ بات ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

> ''حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جو شخص (اپنے دائرۂ اختیار میں) کوئی منکر دیکھے اس کو ہاتھ سے روک دے۔ اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے۔ اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔'' (مسلم)

اس حدیث میں طاقت رکھنے کے الفاظ اپنے اختیار کو نافذ کرنے کے حوصلہ و ہمت کو بیان کر رہے ہیں۔ اس سے یہ مراد قطعاً نہیں کہ اپنے دائرۂ اختیار سے باہر انسان کو طاقت استعمال کرنی چاہیے اور ایسا نہ کرے تو یہ اس کے ضعف ایمان کی نشانی قرار پائے۔ مثلاً ایک باپ کے لیے بیٹی اس کے اس دائرۂ اختیار میں ہے۔ چنانچہ اس کے کسی غلط عمل کو دیکھ کر باپ کو اسے روکنا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ گھر سے باہر جسم کشا لباس پہن کر نکلتی ہے تو بیٹی کو روکنا اس کی ذمہ داری ہے۔ حدیث کا یہ حکم اس باپ سے متعلق ہے۔ اگر وہ اپنی بیٹی کو نہیں روکتا تو اپنے ضعف ایمان کا ثبوت دیتا ہے۔ اس حکم کا کوئی تعلق اس بات

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سے نہیں کہ ایک عام آدمی کسی راہ چلتی خاتون کو، جس نے چادر نہ اوڑھ رکھی ہو زبردستی چادر اوڑھانے کی کوشش کرے۔ اتنی طاقت نہیں تو اسے برا بھلا کہے اور اتنی طاقت بھی نہیں تو اسے دل سے برا سمجھے اور اس حالت میں وہ کم زور ترین ایمان کا حامل ہوگا۔ اس منطق کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

چھٹی بات یہ ہے کہ قرآن میں بیان کردہ معروف و منکر کے الفاظ سے مراد عقل و فطرت اور دین و شریعت کے مسلمات ہیں۔ مثلاً امانت و دیانت مسلمہ اخلاقی اقدار ہیں۔ جھوٹ ایک ثابت شدہ برائی ہے۔ زنا مذہب و معاشرے کی نگاہ میں یکساں طور پر جرم ہے۔ اسی طرح عبادات میں نماز مسلمہ طور پر شریعت کا حکم ہے، لیکن وہ معاملات جن پر علمی طور پر ایک سے زیادہ آرا پائی جاتی ہیں، اس دائرے میں نہیں آتے۔ لہٰذا ایسے کسی معاملے میں کوئی شخص ایک نقطۂ نظر کا حامل ہونے کے باوجود اپنے حلقۂ اختیار میں اسے منوانے کا مکلّف نہیں۔ مثلاً عصر کی نماز کے وقت کے بارے میں امت میں ایک سے زیادہ آرا پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ نماز کا حکم تو زیردستوں کو دینا چاہیے، مگر وقت کے سلسلے میں کسی جبر سے احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ یہ کوئی دینی مسلمہ نہیں۔

ساتویں اور آخری بات یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح کے برخلاف جو انسان کا ذاتی فعل ہے، حق کی نصیحت اور اس پر صبر کی تاکید کا عمل چونکہ دوسروں سے متعلق ہے، اس لیے اس میں حکمت کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ اس حکمت میں مخاطب کی ذہنی استعداد اور اس کی نفسیات وغیرہ کا لحاظ رکھنا بہت اہم ہے۔ اسی طرح اپنی حد کو پہچاننا اور اسی تک محدود رہنا بھی ضروری ہے۔ مخاطب کے لیے دل میں محبت و خیر خواہی کا جذبہ اور گفتگو میں نرمی اور حکمت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان چیزوں کو نظر انداز کر کے جب یہ کام کیا جائے گا تو ہمیشہ الٹے نتائج پیدا کرے گا اور لوگوں کے دل میں دین کی بے وقعتی اور معاشرے میں فساد پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آخری بات

اس تحریر کے آخر میں ہم قارئین کی توجہ اسی چیز کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے جہاں سے بات کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی ہم لوگ کثرت سے اپنے معاشرے کے اخلاقی بگاڑ پر گفتگو کرتے ہیں اور اپنی فکر مندی کا اظہار کرتے ہیں، مگر یہ گفتگو کرتے ہوئے ہم اکثر یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ہم بھی اس قوم اور معاشرے کے افراد ہیں۔ یہ صورت حال اگر پیدا ہو رہی ہے تو ہم اس پر صرف اظہار افسوس کر کے اپنی جان نہیں چھڑا سکتے۔ یہ ہماری، مذہبی، قومی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور کم از کم اپنے دائرے میں غلط رویوں کے خلاف ایک جدوجہد شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں جو ہماری ذمہ داری تھی، وہ ہم نے حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ صورت حال کا ایک مکمل تجزیہ کر کے ہم نے یہ بتا دیا ہے کہ مرض کیا ہے، اسباب کیا ہیں اور علاج کیا ہے۔ اب اپنے طرز عمل کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

جو لوگ اپنی قوم کے حالات سے پہلو تہی کر کے اپنی ذات میں مگن ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی تبصروں پر گزارا کر لیتے

ہیں، تاریخ بتاتی ہے کہ وہ خسارے میں پڑ کر رہتے ہیں۔ آج ہم یقیناً اس خسارے کا شکار ہیں۔ اس افسوس ناک صورت حال کا مشاہدہ خاندان کے ادارے سے لے کر قومی اداروں تک، ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اخلاقی معیارات کی پابندی کرنے والے لوگ اب استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ہم پر فرض کے درجہ میں یہ چیز لازم ہو چکی ہے کہ ہم اس صورت حال کو بدلنے کے لیے جدوجہد شروع کریں۔ اس معاملے میں اپنے لوگوں کی تربیت کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یقیناً ہمیں بدترین تباہی کا سامنا کرنا ہو گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com